آفاقی اسلام
اور جدید تحریک اصلاح کا منہج

راشد شاز

راشد شاز بھارت کے ایک ممتاز صاحب فکر ھیں۔ "اسلام۔ مستقبل کی بازیافت" ان کی اھم کتاب ھے۔ ان کا خیال ھے که اسلام ایک آفاقی دین ھے جس کی برکات سے ساری دنیا مستفید ھوسکتی ھے۔ اس کے لیے ضروری ھے که اسلام کی ایک نئی تعبیر پیش کی جائے جو کسی زمان ومکان یا گروہ سے متعلق نه ھو۔

عام انسانی دنیا سے ماوراء ایک ایسے virtual world کا وجود میں آجانا جہاں کروڑہا کروڑ نفوس ایک دوسرے سے بحث ومباحثہ اور باہمی استفادے میں مشغول ہوں، ایک حیرت ناک وقوعے سے کم نہیں۔ عالم محسوسات سے پرے ایک ایسی اضافی دنیا کا وجود جو مسلسل ہماری زمینی زندگی کو متاثر کررہی ہو، ایسی حقیقت ہے جسے مزید نظرانداز کرنا اب ماضی پرست قوموں کے لیے بھی ممکن نہیں رہا۔ صحیفوں کی نشرواشاعت کا یہ عالم ہے کہ جس موضوع پر بھی بٹن دبایئے معلومات کا ایک لامتناہی سمندر موجود ہے۔ ہر قسم کے افکار وخیالات اپنی تمام خباثتوں اور سعادتوں کے ساتھ قاری کے منتظر ہیں۔ انٹرنیٹ کی اس virtual دنیا میں نہ کوئی محتسب مؤثر رہ گیا ہے اور نہ ہی کسی خیال کو محض قوت کی بنیاد پر دباڈالنا ممکن ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس سائبر دنیا کا نہ کوئی مرکز ہے اور نہ ہی کسی خاص تہذیب یا عسکری قوت کی اس دنیا پر اجارہ داری ممکن رہ گئی ہے۔ گویا سائبر سپیس ایک ایسی پوسٹ ماڈرن دنیا کی ایک جھلک ہے جہاں خیالات کو محض اس کی حقیقی قدر وقیمت کی بنیاد پر قبول یا رد کیا جانا ممکن ہوسکے گیا۔ اب انسانی دل ودماغ کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مولوی یا محتسب کی چیرہ دستیوں سے یکسر آزاد ہوکر تہذیبی اور قومی سطح سے اوپر اٹھ کر اللہ کے عطا کردہ قلب سلیم کو حتی المقدور استعمال میں لائے اور پھر اپنی صوابدید پر، عقل ونظر کی روشنی میں اپنے لیے ایک بہتر راستے کا انتخاب کرسکے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں شیطان کے وساوس بھی ہیں اور خدا ترسوں کی درمندر رہنمائی بھی۔ فقہاء ومشائخ کے طے کردہ حتمی جواب بھی ہیں اور وحی ربانی کو سمجھنے کے لیے خود اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت بھی۔ اگر ایک طرف مختلف نظریات کا اپنا اپنا مسحور کن پروپیگنڈہ ہے تو دوسری طرف اس کے رد میں بھی کم مضبوط دلائل نہیں۔ واشنگٹن کے پرآسائش سوٹ میں بیٹھنے والا انسان ہو یا افغانستان کے نامعلوم پہاڑی سلسلوں میں بسنے والا شخص، انٹرنیٹ کی دنیا میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔

دیکھا جائے تو انسانی تاریخ میں فکر ونظر کی آزادی کا اتنا وافر امکان پہلے کبھی نہ تھا۔ قلب ونظر کو جلا بخشنے کے لیے جس ذہنی افق اور بین الاقوامی مباحثے کی ضرورت تھی، اس کا ماحول تیار ہوچکا ہے۔ اس نئی صورتحال نے روایتی علماء کے قیل وقال سے پرے فرقہ وارانہ تعبیر اور مسلکی تشریحات سے ماورا، ایک ایسے ہمہ گیر مباحثے کی بناء ڈال دی ہے جس کے بطن سے فی زمانہ دین خالص کے طلوع ہونے کے امکانات وا ہوگئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں فکر ونظر کی بے مہار آزادی ہمیں ایسے سطحی اور junk مباحثے میں بھی الجھا سکتی ہے جس سے ہماری موجودہ پریشان خیالی میں مزید اضافہ ہوجائے۔ انفارمیشن کے اس سیلاب میں ڈس انفارمیشن کے ریلے بھی بہہ رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ تو بہرحال کرنا ہوگا۔ دودھ کو پانی سے اور حق کو باطل سے ممیّز کیے بغیر ہماری منزل بامراد نہ ہوگی۔ البتہ جو لوگ وحی کی روشنی کو اپنی مشعل راہ بنانے کا عزم رکھتے ہوں ان کے

لیے عمومی کنفیوژن کی اس فضا میں راستہ بنانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سائبر ورلڈ میں کسی نئے اسلام کے ظہور کے منتظر یا اس کے لیے کوشاں ہیں۔ دین خالص وحی ربانی کو ایک ایسی صورت حال میں پیش کرنے سے عبارت ہے جب زمان ومکان یا تہذیبی مظاہر کا پرتو وحی ربانی پر تقریباً معدوم ہوگیا ہو۔ خدا کا دین بندوں کی اس سائبر دنیا میں کچھ اس طرح جلوہ فگن ہوگویا وہ تمام انسانوں کو شمولیت کی یکساں دعوت دے رہا ہو۔ نہ وہ مشرق کا پرستار ہو نہ مغرب کا مخالف، نہ اسے عربوں سے کوئی خاص انسیت ہو نہ عجمیوں سے کسی درجے کی مخاصمت، نہ وہ ایشیاوالوں کا دین سمجھا جاتا ہو اور نہ کسی ایسے خاص تہذیبی قالب کا حامل کہ اہل مغرب اسے Middle-Eastern Religion قرار دیتے ہوں، گویا ایک ایسا اسلام جس کی مکمل تصویر قرآن مجید کی دفتین میں پائی جاتی ہو اور جسے سمجھنے کے لیے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ یا اموی، عباسی جاہ وحشم کے بیان کی چنداں ضرورت نہ ہو اور نہ ہی مسلم اسپین، مغل دہلی اور عثمانی ترکوں کی تہذیبی تاریخ کا اس پر پرتو پایا جاتا ہو۔ ایک ایسا اسلام جو تمام انسانیت کا نجات دہندہ ہو اور جس کے غلبے کی دعوت کسی خاص قوم کے تہذیبی غلبہ کی نفی سے عبارت ہو۔ محمد رسول اللہ جو کہ کافۃ للناس بشیر اونذیر ا ہیں اور جن کی رحمۃ للعالمینی پر قرآن کے صفحات گواہ ہیں، ان کی دعوتِ لاالٰہ کی منطقی انتہا ایک ایسے ہی منظرنامے کی طالب ہے جب تمام مسلکی مظاہر سے اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر انسانوں کو خدائے واحد کی بندگی میں مربوط کر دیا جائے۔ ایک ایسے غیر تہذیبی سلام کے ظہور کے لیے سائبر دنیا سے بہتر اور کون سی جگہ ہوسکتی ہے؟

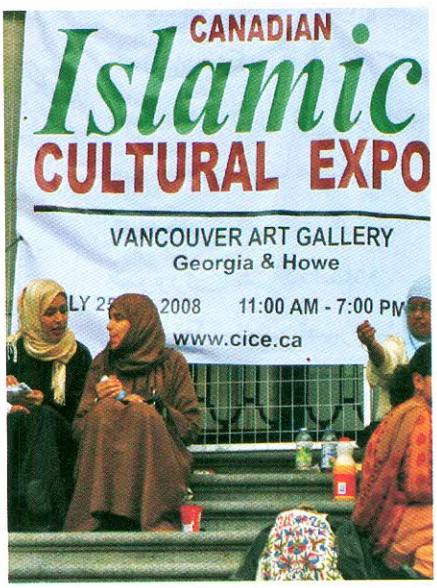

روایتی مسلم ذہن کے لیے سائبر ورلڈ نئے چیلنجز کی آماجگاہ ہے۔ قدیم فقہی اصطلاحوں کا یہاں سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ سائبر ورلڈ میں دارالسلام اور دارالکفر کی اصطلاحیں بے معنی ہوکر رہ گئی ہیں، یہاں نہ کوئی centre ہے اور نہ periphery۔ بیک نظر مجموعی طور پر اس دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ امکانات کے اس سمندر سے فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کوزے میں کیا کچھ توشہ جمع کرتا ہے۔ کل تک جو لوگ دنیا کو تہذیبی اکائیوں میں منقسم دیکھنے کے عادی تھے، یا جو محمد رسول اللہ کے آفاقی پیغام کو عرب تہذیب میں محدود کیے دینے کے قائل تھے، یا جو یہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ عرب تہذیبی مظاہر ہی دین اسلام کا آفاقی پیغام ہے، اپنے قدیم عربی قالب سے ماورا تمام انسانوں کے لیے یکساں توجہ اور کشش کا باعث بن رہا ہے۔ ہمارے زوال کے عہد میں تحفظ اسلامی کی خاطر عرب تہذیبی مظاہر پر غیر ضروری اصرار کی جو لے اپنے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے یہاں غیر معمولی طور پر بلند ہوتی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں اسلام کو عرب مشرقی ورثے کے طور پر دیکھنے کا رواج عام ہوا، التباسات کی یہ دھند بھی اب چھٹنے کو ہے۔ ﴿اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ کی عمومی فضا میں اب ہمارے لیے یہ سمجھنا آسان ہے کہ آفاقی نبی کی امت کسی ایک تہذیبی مظہر، جغرافیائی ماحول اور اس سے متاثر لباس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اب بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص زبان سے اسلام کو نفرت ہے یا کوئی خاص لباس غیر قوموں کا لباس ہے جس کے پہننے سے اسلام رخصت ہوجاتا ہے تو اس کا یہ سمجھنا ایک بین الاقوامی پیغمبر کی آفاقیت کو مشتبہ کر دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکانی فاصلوں کے سکڑنے کی وجہ سے اب یہ مفروضات خود بخود ختم ہو رہے ہیں۔ کل تک جو بات فقہائے حنابلہ، فقہائے احناف کے لیے سمجھنا مشکل تھی اور جس کی وجہ سے تہذیبی مظاہر کی بنیاد پر کفر واسلام کے فتوے صادر کرنے کا رواج عام تھا آج وہی بات نئی سکڑتی دنیا میں قرآن کے معمولی طالب علم کے لیے بھی سمجھنا آسان ہوگئی ہے کہ تہذیبی مظاہر یا لباس کی بنیاد پر کفر واسلام کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ ابن تیمیہ کا یہ فہم جس کا شدید اظہار انہوں

نے اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفة اصحاب الجهیم میں کیا ہے اور اس قبیل کے دیگر علماء کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ دین کی اس خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھی ہے۔ ﴿اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ﴾ کے موجودہ ماحول میں ان فتووں پر کسے یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا ترشوانا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہوسکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی خالص قومی اور تہذیبی تعبیر نے ایک آفاقی دین کو نہ صرف یہ کہ ایک عرب مشرقی ورثے کی حیثیت دے دی بلکہ آنے والے دنوں میں حاملین قرآن کے لیے خالص قومی بنیادوں پر مسابقت کی طرح بھی ڈال دی۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی عالمی غلبہ کا خواب دیکھنے لگے۔ پندرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے غلبۂ اسلام کی جو امید بندھی تھی اس سے غیر تو یہ سمجھتے ہی تھے کہ مسلم قوم ایک بار پھر دنیا پر اپنے سیاسی غلبہ کا خواب دیکھ رہی ہے، خود مسلم ذہنوں میں بھی اسلامی صدی کا مفہوم اس سے کچھ مختلف نہ تھا کہ صدیوں سے جو قوم مسلسل پسپائی اختیار کرتے ہوئے تاریخ کے حاشیے پر چلی گئی ہے وہ ایک بار پھر دنیا پر غالب ہونے کو ہے۔ قومی اسلام کے اس تصور نے دوسری قوموں کی طرح اسلام کو مسابقت کی اس دوڑ میں مبتلا کر دیا۔ اہل یہود جن کا دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی موثر ترین سرگرمیوں کی وجہ سے اکیسویں صدی کی قیادت کے سب سے زیادہ سزاوار ہیں یا مغرب کی بعض اقوام خصوصاً امریکہ جو اکیسویں صدی پر مکمل غلبہ کو اپنا حق سمجھتا ہے، اسی طرح مسلم ذہنوں میں بھی قومی اسلام کے زیر اثر یہ خیال پرورش پاتا رہا ہے کہ پندرہویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی کے آخر میں مسلمانوں کے غلبہ واستیلاء کی صدی کیوں نہ ہو؟ افغانستان میں سویت یونین کی شکست کے بعد مجاہدین کی جواں سال قیادت کے ذہنوں میں فطری طور پر اس خیال نے انگڑائی لی کہ سویت یونین کے زوال کے بعد اب ان کا منطقی وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دیں۔ ان کے نزدیک مغرب پر مشرق کی فتح کا یہ ہی ایک واضح اور آسان راستہ تھا۔ اس میں شبہ نہیں بن لادن اور دوسرے عرب مجاہدین کو اس تہذیبی ٹکراؤ کی راہ پر ڈالنے والے دوسرے عناصر بھی تھے البتہ مغرب کے مقابلے میں ایک مشرقی اور قومی اسلام کی فتح کا داعیہ ان کے دل ودماغ کو مسلسل مہمیز کرتا رہا ہے۔ تہذیبی اسلام کا یہ مروجہ قالب جو عرب مشرقی ثقافت کو اسلام کو لازمی جز قرار دیے بیٹھا ہے، نفسیاتی طور پر اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسری تہذیب کی سعید اور صالح روحوں کو بھی غلبۂ اسلام کے منصوبے میں شامل کر سکے یا یہ کہ اسلام کو ایک ایسے ہمہ گیر بین الاقوامی قالب میں متحضر دیکھے جہاں تہذیبوں کے بجائے صرف وحی ربانی کی بنیاد پر ایک نئی دنیا کی تعمیر کا منصوبہ پایا جاتا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مروجہ تہذیبی اسلام نے مسلم نوجوانوں کے ذہنوں سے اسلام کی آفاقیت اور تمام ہی اقوام وملل کے لیے نصح وخیر خواہی، ہمدردی وغم گساری جیسے جذبات کو دور کر رکھا ہے جو داعی کی بنیادی صفت ہے۔ اسلام کو اس محدود تہذیبی خول سے نجات دلانے اور اسے پیغمبرانہ آفاقی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے ہمیں اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کے تحت احتساب کی ضرورت ہوگی۔ اندیشہ ہے کہ اس عمل میں بڑے بڑے شارحین اور علمائے عظام کا اعتبار ساقط ہو جائے۔ جو لوگ بعض اصحاب سلف کو یا اپنی پسند کے ائمہ وفقہاء کو قرآن مجید کی شاہ کلید قرار دیتے آئے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے بغیر فہم قرآن کا قفل نہیں کھل سکتا، ان کے لیے اس صورت حال کا ادراک

کیا اهل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیه کی طرح اس عقیدے کا متحمل هوسکتا هے که جنس عرب جنس عجم سے افضل هے؟

یقیناً مشکل ہوگا۔ صدیوں سے جولوگ اسلامی فلسفہ، اسلامی آرٹ، اسلامی فنون لطیفہ اور اسلامی طرز تعمیر جیسی اصطلاحوں میں کلام کرتے رہے ہیں، ان کو یہ باور کرانا کچھ آسان نہ ہوگا کہ عباسی بغداد کا فنون لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نقوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کے لیے مامور ہی نہیں کیے گئے تھے۔ قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کار نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ رہا علم وحکمت اور علوم وفنون کی ترقی تو یہ کسی قوم کی میراث کبھی نہیں سمجھے گئے۔ یہ نوع انسانی کا مشترکہ ورثہ ہیں اور انہیں اسی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے۔

قومی اسلام کا یہ تصور جس کی جڑیں ہمارے متقدمین کی فہم وبصیرت میں ہیں، خالص اسلام کی طرف ہماری مراجعت میں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اسلام کے اس قومی تصور نے فی زمانہ پوری دنیا میں مسلم نوجوانوں اور ان کی احیائی تحریکوں کو ایک غول بیابانی میں تبدیل کر رکھا ہے۔ قدیم مشرقی ثقافتی علامتوں کو وہ اسلام سمجھ بیٹھے ہیں، جس سے ذرہ برابر بھی انحراف کفر واسلام کی جنگ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جغرافیائی تنازعے اور وطنی آزادی کی تحریکیں جہاد فی سبیل اللہ قرار پاتی ہیں۔ ثقافت اور اسلام کے اس مسلسل دھوپ چھاؤں کے کھیل نے خود مسلم ذہنوں پر اسلام کی ماہیت اور اس کے مستقبل کے سلسلے میں سخت ابہام اور مغالطوں کو جنم دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان گذشتہ چند صدیوں سے من حیث القوم مسلسل پسپائی کا شکار ہیں اور گذشتہ چند برسوں سے پسپائی کا یہ عذاب اپنی انتہا پر ہے۔ افغانستان، عراق، فلسطین، بوسنیا، کشمیر، گجرات، فلپین اور چیچنیا جہاں بھی خون بہہ رہا ہے وہ ان ہی قومی مسلمانوں کا خون ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور مغرب کے دوسرے شہروں میں دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوان ہی نشانے پر ہیں۔ گوانتانا موبے کی عقوبت گاہ یا ابوغریب کی جیل میں جو کچھ ہوا اس کا شکار بھی مسلم قوم ہی بنی۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر مسلمان بھی مدافعت کی جنگ میں ان اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کر گئے تو پھر دوسری قوموں سے ان کی وجہ امتیاز کیا رہ جائے گی؟ گجرات میں ہم جلائے گئے، بوسنیا میں ہماری عزتیں تاراج ہوئیں۔ فلسطین میں ہم ایک منظم ریاستی دہشت گردی کا شکار ہیں لیکن اس کے جواب میں ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ عین یہی سب کچھ نہیں کر سکتے۔ قومی مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی قوم کے مقابلے میں دشمن قوم کو زک پہنچانے کے لیے کوئی بھی اقدام کر ڈالیں۔ البتہ وحی کا آفاقی نقطۂ نظر ہمیں مسلسل اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم بعض شیطان صفتوں کی وجہ سے اس پوری قوم کو من حیث القوم قابل گردن زدنی قرار نہیں دے سکتے۔ ہم جو انسانوں کی خیر خواہی اور ان کی فلاح ونجات کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ہم انہیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ ہیں نہ یہ کہ ان کا تعلق کس قوم سے ہے۔ بڑے بڑوں کے دل ودماغ پر مسلم قومی افتخار اور مسلم قومی مفاد کے جذبات اتنے شدید ہیں کہ وہ کسی بھی مسئلہ پر خالص حامل قرآن کی حیثیت سے سوچنے کا یارا نہیں رکھتے۔ مسئلہ فلسطین کا لاینحل ہونا، خدائے واحد کی علمبردار دو قوموں کا اتنے طویل عرصے تک آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہونا اور پھر اس صورت حال پر مسلمانوں اور اہل یہود کی علماء ومتقین کا مسلسل خاموش رہنا اسی بات کا تو ثبوت ہے کہ اہل یہود کے علماء کی طرح مسلم اہل فکر بھی قومی افتخار کے اس حد تک اسیر ہو گئے ہیں کہ وہ کوئی غیر روایتی حل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ دنیا فساد سے بھرتی جا رہی ہے۔ قوموں کے تصادم کے اس ماحول میں جہاں خود حاملین قرآن بھی بدقسمتی سے اس قومی تصادم میں فریق بن گئے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آفاقی اسلام کو وحی کے دفتین سے از سر نو برآمد کیا جائے جس کے پس پشت چلے جانے کی وجہ سے ہم تاریخ کے انحراف میں جینے پر مجبور ہیں۔

قومی اسلام کا یہ تصور جس کی جڑیں ہمارے متقدمین کی فہم وبصیرت میں ہیں، خالص اسلام کی طرف ہماری مراجعت میں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔

اسلام میں اصلاحی تحریک کی معنویت

فی زمانہ مکہ سے واشنگٹن تک اسلام کی تجدید واصلاح کا غلغلہ ہے گو کہ اسلام میں اصلاحی تحریک کا تصور کوئی اجنبی خیال نہیں ہے۔ البتہ اصلاح کے جو شدید دعایات اس وقت پائے جاتے ہیں شاید ایسی شدت اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی اور اس حقیقت کے باوجود کہ اسلام میں تجدید واصلاح کی نظری اساس پائی جاتی ہے آج اسلام کو اندر سے بدلنے کے لیے جو خارجی عوامل کام کر رہے ہیں اس نے اس کی تجدید واصلاح کی ہر مخلصانہ کوشش کو شبہات کے دائرے میں داخل کر دیا ہے۔ مزید برآں مغرب میں جو دانشور اس وقت اصلاح کے علمبردار ہیں ان کا اصل ہدف اسلام کو عصری تناظر سے ہم آہنگ کرنے کی بجائے یہ ہے کہ اسلام کو کس طرح قابو میں کیا جائے تاکہ ایک ایسے اسلام کی تشکیل ممکن ہو جو مغرب کے لبرل فریم ورک میں فٹ آسکے۔ مغرب نے اس سے پہلے عیسائیت اور یہودیت کے ساتھ اسی نہج پر کامیاب تجربات کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اہل یہود اور اہل کلیسا کی طرح مسلمان بھی مغرب کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام سے خود کو ہم آہنگ کر سکیں تو مغرب کے لیے اس کے سب سے خطرناک مفروضہ دشمن اسلام سے بزور ساز و نمٹنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

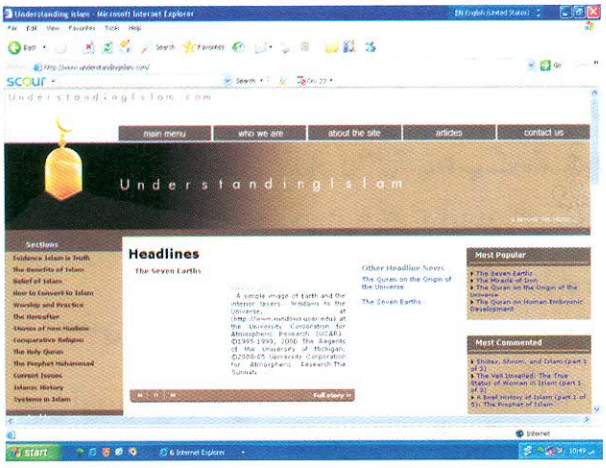

تحریک اصلاح کی علمبرداروں میں ایک طبقہ ان مسلم دانشوروں پر مشتمل ہے جن کی تعلیم وتربیت مغربی دانش گاہوں میں ہوئی ہے۔ مسلمان مصلحین کی یہ نسل خود کو ابن حزم، داؤد ظاہری، ابن تیمیہ، ابوحامد غزالی، محمد بن عبدالوہاب، شاہ ولی اللہ اور ان جیسے دیگر مصلحین کا توسیعہ سمجھتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ماضی میں مسلمان تحریک تجدید واصلاح کا والہانہ استقبال کرتے آئے ہیں اور ان دلوں میں اپنے مصلحین کے لیے تحسین کے جذبات پائے جاتے رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جب آج اس تجدیدی عمل کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت، ہم اصلاحی تحریک پر اعتراض وارد کریں۔ البتہ ماضی کی طرح یہ سوال ابھی تک حل طلب ہے اگر ماضی کی اصلاحی تحریکیں اسلام کو اس کے اصل قالب تک لوٹانے میں ناکام رہی ہیں اور اگر ماضی میں تجدید واصلاح کی کوششیں امت مسلمہ پر ایک نئی صبح طلوع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں تو آخر کیسے ممکن ہے کہ اجتہاد کی یہ سعی بلیغ آج بامراد ہو سکے گی۔ گزشتہ کئی صدیوں سے مسلم مصلحین کتاب وسنت کی طرف واپسی کی صدا لگاتے رہے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صدیوں کی ان شب و روز جدوجہد کے باوجود رجوع الی الکتاب والسنۃ کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہمیں اس بات پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے بہترین دماغ اور مخلصانہ جدوجہد رجوع الی القرآن کے ہدف کو حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ گویا عہد جدید کے مصلحین پر دوہری ذمہ داری آپڑی ہے۔ اولاً انہیں کمال ژرف نگاہی سے اس بات کا جائزہ لینا ہے کہ متقدمین کی ناکامیوں کی بنیادی وجوہات کیا تھیں۔ ثانیاً انہیں ساتھ اس بات کا التزام بھی کرنا ہے کہ فی زمانہ رجوع الی القرآن کی کامیاب کوششوں کے لیے کس طریقۂ کار کا اختیار کرنا مناسب ہوگا اور یہ کس طرح ایک بار پھر اسلام کی حقیقی روح ہم پر منکشف ہو سکے گی۔ گویا جدید مصلحین کو ابتدا ہی سے اس بات کا التزام کرنا ہوگا کہ وہ تاریخی اسلام اور نظری اسلام میں نہ صرف یہ کہ امتیاز کریں بلکہ مطالعۂ قرآنی میں ایک ایسے منہج کی داغ بیل ڈالیں جس کے ذریعہ انسانی تعبیرات اور التباسات کے پردوں کا چاک کیا جانا ممکن ہو۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے جب ہر مسئلہ کو از سر نو تحقیق وتجربہ کا موضوع بنایا جائے اور ہر مسئلہ پر قرآنی دائرۂ فکر میں از سر نو گفتگو کا آغاز ہو۔ یقین جانیے اگر ہم قرآن مجید کو حکم مانتے ہوئے اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کا ناقدانہ جائزہ لینے کی جرأت پیدا کرنے میں کامیاب

ہو گئے تو ہم خود فکری طور پر نزول وحی کے ان ایام میں پائیں گے جب وحی کی ضیا پاشیاں ہمارے قلب ونظر کو منور اور ہمارے ملی وجود کو طمانیت سے سرشار رکھتی تھیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے اعتراف حقیقت کے طور پر اور آزادانہ غور وفکر کی راہ ہموار کرنے کے لیے ہمیں یہ کہہ لینے دیجیے کہ ماضی میں اصلاحی تحریکیں اپنی تمام تر رفعتوں کے باوجود اگر اسلام کے اس نظری ماڈل کی بازیافت میں کامیاب نہ ہوسکیں یا اپنی تمام تر خواہشوں کے باوجود عہد رسول کے Spatial ماحول میں ان کی واپسی ممکن نہ ہوسکی تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مصلحین عہد رسول میں واپسی بطریق مسلک فقہی چاہتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اس سد تاریخ کو عبور کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو حنفی، شافعی یا دوسرے فقہی فکر کے ارتقاء نے ان کے سامنے کھڑی کر دی تھیں۔ اقبال جیسا صاحب بصیرت جو قرآن مجید کے گہرے مطالعے کی وجہ سے بلاشبہ منصب اجتہاد پر فائز تھا خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتا ہے کہ وہ عادتاً حنفی ہے گویا بخاطر سہولت انہوں نے حنفیت کا دامن تھام رکھا ہے۔ کچھ یہی حال ان تمام مفسرین اور ائمہ اصلاح کا بھی ہے جو تمام عمر دین مبین کی شخصی تعبیر سے اپنا دامن چھڑانے کے باوجود خود کو کسی نہ کسی فقہی خیمے کا توسیعہ بتاتے رہے ہیں۔ جب یہ خیال عام ہو چکا ہو کہ چار فقہی مکاتب سے ماورا اہل سنت والجماعت کے ہاں دین مبین کی کوئی مستند تعبیر ممکن نہیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس فقہی سد تاریخ کو عبور کرتے ہوئے کوئی مصلح قرآن کے واقعی دائرۂ فکر میں واپسی کا ہدف حاصل کر پاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رجوع الی القرآن کی تمام تر تحریکیں قرآنی دائرۂ فکر میں واپسی کی بجائے متعلقہ فقہی خیموں کی توسیع اور انکے استحکام پر منتج ہوئیں جس کی وجہ سے وحی ربانی کی اصل آب وتاب کے ساتھ بازیافت ممکن نہ ہوسکی۔

اس میں شبہ نہیں کہ فی زمانہ ماضی کے مقابلہ میں تحریک اصلاح کے لیے کسی واقعی کامیابی کے امکانات کہیں زیادہ ہیں۔ اولاً امت کے علماء ودانشوروں پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فکر ونظر کے قدیم فقہی زاویے جدید دنیا کا محاکمہ نہیں کر سکتے۔ ثانیاً تجدید واحیائے اسلام کی تحریکیں اپنی تمام تر والہانہ سرگرمیوں کے باوجود مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں اور یہ کہ اس طرز عمل کو مزید طول دینا مستقبل میں بھی کسی کامیابی کی ضمانت نہیں بن سکتا۔ ثالثاً یہ بات اب ہر خاص وعام پر واضح ہوتی جارہی ہے کہ انٹرنیٹ کے عہد میں اب کوئی isolationist طریقۂ کار کامیاب نہیں ہوسکتا اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اس سکڑتی دنیا میں کوئی بھی مذہبی گروہ صرف اپنی نجات کے لیے اردگرد سے بے تعلق ہو کر کوئی قابل عمل طرز زندگی تشکیل دے سکے۔ رابعاً اہل فکر کے حلقوں میں یہ خیال اب رفتہ رفتہ عام ہوتا جارہا ہے کہ مسلم فکر جو مختلف تاریخی مراحل طے کرتے ہوئے مختلف شارحین کی مداخلت اور تعبیرات کے نتیجے میں موجودہ مروجہ شکل میں سامنے آئی ہے، اس میں وحی کی تجلیاں اب اس روایتی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر نہیں ہیں۔ اس لیے مسلم فکر میں انسانی تعبیراتی عناصر کی نشاندہی اب ضروری ہوگئی ہے۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ وحی جیسے نتائج تعبیرات وحی سے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ خامساً ایک borderless world کے وجود میں آجانے سے پہلی بار یہ احساس عام ہوا ہے کہ اقوام عالم کی امامت پر فائز اور رحمۃ للعالمین کے متبعین آج ایک all-embracing وسعت کی بجائے اپنے دل ودماغ کو فرقہ وارانہ طرز فکر کا اسیر پاتے ہیں۔ ان کے ایجنڈے میں امت محمدیہ کی نجات اور اس کی فلاح وبہبود کی باتیں اتنی عام ہیں کہ غیر اقوام ان کی باتوں میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتیں۔ گویا عرصے سے وہ مفروضہ دارالاسلام میں محصور فلاح امت کے منصوبوں میں اتنے مشغول رہے کہ رحمۃ للعالمینی کا عنصر ان کی شخصیت سے یکسر محو ہو گیا ہے۔ بے لوث پیمبرانہ صدا کی تلاش اور دکھے دلوں کی مسیحائی کے لیے عام انسانوں کی نگاہیں اب ان کی طرف نہیں اٹھتیں۔ یہ ایک ایسا قلق ہے جس کی چبھن اہل فکر مسلمان شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ گویا ماضی کے مقابلہ میں آج وحی ربانی

انٹرنیٹ کی دنیا میں شیطان کے وساوس بھی ہیں اور خدا ترسوں کی درمند رہنمائی بھی۔ فقہاء ومشائخ کے طے کردہ حتمی جواب بھی ہیں اور وحی ربانی کو سمجھنے کے لیے خود اپنے دل ودماغ کو متحرک کرنے کی دعوت بھی۔

کی بازیافت کے امکانات پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ البتہ وحی ربانی کی بازیافت کے لیے کسی منہج کے تعین کے سلسلے میں ہنوز خوفناک سناٹا طاری ہے۔ خطرہ ہے مبادا ایسا نہ ہو کہ دائرۂ فکر قرآنی میں واپسی کا یہ زریں موقع بھی گنوا دیا جائے اور عالم انسانیت مزید چند صدیوں کے لیے آخری وحی کی تجلیوں سے محروم رہ جائے۔

تحریک تجدید و اصلاح کا مجوزہ منہج

تحریک اصلاح کا ہدف اسلام میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں بلکہ ان انسانی تعبیرات کا محاکمہ ہے جو اپنے تاریخی اور مکانی تناظر کے غیاب کی وجہ سے اب فرسودہ معلوم ہوتی ہیں۔ جدید مصلحین کے دل و دماغ پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ان کا کام انسانی تعبیرات کے التباسات سے اپنا دامن بچانا ہے۔ وہ اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ نص قرآنی میں تغیر و تبدل کی سفارش کریں۔ ساتھ ہمیں اس بات کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ قدیم تعبیرات، اس کی تراش وخراش اور اس کے حصار سے باہر آنے کی کوشش اگر سابقہ انداز سے ہی جاری رکھی گئی تو نئی تحریک اصلاح کے نتائج بھی ماضی کے ناکام تجربوں سے مختلف نہ ہوں گے۔ گویا نئی تحریک اصلاح ابتداء سے انتہاء تک ایک نئے لب و لہجے اور منہج کی حامل ہوگی جس کے بارے میں وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ ماضی کی تمام جدوجہد کے مقابلہ میں یہ کہیں ہمہ گیر اور اپنے منہج میں روح قرآنی سے قریب تر ہوگی۔ اس مرحلے میں جن امور کا خیال رکھنا ہوگا انہیں اجمالاً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱- نئی تحریک اصلاح کو ابتداء سے ہی ان اصطلاحات کے استعمال میں محتاط رہنا چاہئے جن کے پیچھے ایک ثقافتی تاریخ ہے۔ مثلاً Reformation یا Enlightenment جیسے الفاظ نہ صرف عام ذہنوں میں ان کوششوں کے سلسلے میں کنفیوژن پیدا کر سکتے ہیں بلکہ خود تحریک اصلاح ان اصطلاحات کے تاریخی اور تہذیبی بوجھ سے متاثر ہو سکتی ہے۔ مغرب میں ریفارمیشن کے پیچھے چرچ کے جبر و ظلم کی جو تاریخ رہی ہے اور جس طرح عیسائیت نے انسانی عقل پر صدیوں تالے لگائے رکھنے کی کامیاب کوشش کی، جبر کی یہ صورتحال مسلم ثقافت کے بدترین ادوار میں بھی نہیں ملتی۔ احبار اسلام اور جابر حکمرانوں کے مقابلے میں اہل عزیمت کے فکری و عملی خروج کو بڑی حد تک مسلمہ اعتبار حاصل رہا ہے۔ لہٰذا جو لوگ آج اسلام میں کسی Luther یا Calvin کے ظہور کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ مسلم تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کچھ یہی حال Enlightenment کی اصطلاح کا ہے جسے فی نفسہ ان معنوں میں تو قبول کیا جا سکتا ہے کہ انسانی عقل کسی چیز کو قبول کرنے سے پہلے اسے ہر طرح لازماً پرکھے البتہ مغرب کے Enlightenment کے تجربے کو شاید ہی کوئی سلیم الفکر شخص عہد جدید میں دوہرانا چاہے گا۔ ایسا اس لیے ہے کہ جیسا کہ جرمن فلاسفر Max Horkheimer اور Theodor Adorno کا کہنا ہے Enlightenment سے جہاں بہت سے فوائد حاصل ہوئے ہیں وہی Holocaust بھی اسی تحریک کا ایک فال آؤٹ ہے۔ بقول ازایہ برلن Enlightenment نے صرف Holocaust پیدا نہیں کیا بلکہ کمیونزم کا جبر، گلاگ بھی اسی کا منطقی نتیجہ ہے۔ بات کچھ یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اٹھارہویں صدی میں عقل پر غیر معمولی انحصار کا نتیجہ یہ نکلا کہ Jefferson، Kant اور Hume جیسے اصحاب دانش بھی اس خیال کے اسیر ہو گئے کہ سفید فام اقوام کے مقابلے میں دوسری قومیں کم تر ہیں جنہیں تہذیب شناسی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح Enlightenment جو ابتداء میں دانش انسانی کا نقیب بن کر سامنے آیا تھا فی الواقع سفید فام اقوام کے جبر واستیلاء کا اعلامیہ بن کر رہ گیا ہے۔ نئے مصلحین اسلام کے لیے لازم ہوگا کہ وہ Enlightenment یا Reformation جیسی value-loaded اصطلاحوں سے یکسر اجتناب کریں۔

۲- اس میں شبہ نہیں کہ لوتھر کی تحریک اصلاح جس نے عیسائی دنیا کو ایک فجر جدید کا مژدہ سنایا تھا اس کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ چرچ کے مقابلے میں scripture کو حکم کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ اس طرح Mandate of Humans کے مقابلے میں Mandate of God کی بالادستی یقیناً ایک انقلاب انگیز خیال تھا جس سے عیسائیت کے علاوہ دوسرے مذاہب کی اصلاحی تحریکیں بھی اگر غذا حاصل کریں تو اسے تحسین کی نظر سے ہی دیکھا جانا چاہیے۔ البتہ مصلحین اسلام کے ذہن یہ فرق واضح رہے کہ عیسائیت میں scripture کی جو حیثیت ہے، قرآن کا مقام اس سے کہیں اعلیٰ وارفع ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن دوسرے صحف سماوی کے معنوں میں scripture ہے ہی نہیں لہٰذا اس کی تشریح وتعبیر بانداز scripture نہیں کی جاسکتی۔ یہاں ایک ایک لفظ متعین، معروف، محفوظ اور منزل من اللہ ہے جس میں مرتبین یا مترجمین کی دخل اندازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۳- عرصے سے حکمائے اسلام نے عقل اور وحی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ رکھا ہے۔ یہ خیال عام ہے کہ علوم عقلیہ اور نقلیہ الگ الگ ماخذ سے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایک کی بناء مشاہدے اور دوسرے کی بناء وجدان پر ہے۔ مسلم متکلمین مشاہدے کے مقابلے میں وجدانی علوم کے تفوق کے قائل رہے ہیں۔ اس لیے ان کے یہاں مشاہداتی علوم کے سلسلے میں ایک طرح کی بے توقیری کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید، جو مسلمانوں میں وجدانی علوم کا بنیادی ماخذ ہے، تدبر وتفکر اور مشاہدے کی بھرپور وکالت کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وجدان کی عمارت تعقل کی بنیادوں پر رکھی جائے۔ بھلا جو وجدان عقل کو قائل نہ کرسکے یا جو دانش انسانی کی پہنچ سے باہر ہو اسے انسانوں کے لیے مشعل راہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ قرآن فی نفسہ ایک rational discourse ہے جس کا اسلوب مفتیانہ یا dogmatic نہیں بلکہ reflective ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ خدا کی وحدانیت، انبیاء ورسل کی حقانیت اور دین کے طریقۂ نجات ہونے کو بغیر کسی rational discourse کے قبول کرلیا جائے۔ اگر ایسا مطلوب ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ توحید ورسالت کی بنیادی دعوت کو باسالیب مختلف ساڑھے چھ ہزار سے زائد آیتوں میں بار بار بیان کرنے کی ضرورت پیش آتی۔

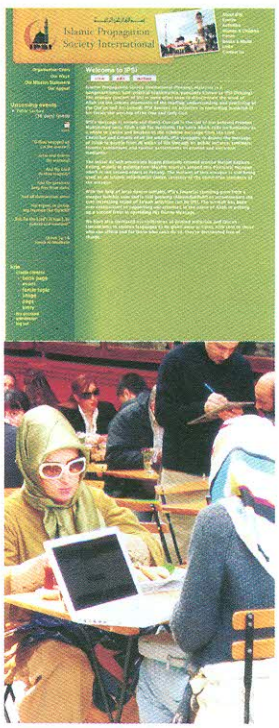

انسانی عقل کی بھی یہ کیسی آزمائش ہے کہ اپنی تمام تر تنگ دامانی کے باوجود اس پر کائنات کی ماہیت کے ادراک اور خالق کے عرفان کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ انسان انسان جو ٹھہرا، وہ عرفان ذات اور عرفات حق کے مختلف مراحل میں یقیناً غلطیاں کرے گا پھر اپنی غلطیوں سے سیکھے گا بھی۔ اندیشوں اور امکانات کے مابین اسے اختیار کی آزادی دے کر خدا خود یہ چاہتا ہے کہ انسانی عقل وحی سے اکتساب فیض کرتے ہوئے اپنی جولانیاں دکھائے۔ لہٰذا صرف اس اندیشے کے پیش نظر کہ عہد جدید کے مصلحین حساس امور پر زبان کھولنے میں غلطیوں کا ارتکاب کرسکتے ہیں، انسانی عقل پر پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عقل وآگہی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھنے کی بجائے ایک دوسرے کا رفیق ومددگار قرار دیا جائے۔ قدیم اسلامی تعبیرات کو ایسے منجمد عقائد (dogma) کی حیثیت سے نہ دیکھا جائے جسے negotiate نہ کیا جاسکتا ہو۔ یہ کام خاصا آسان ہوجائے گا اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ ہمارے متقدمین جنہوں نے ماضی میں تشریح وتعبیر کا فریضہ انجام دیا ہے وہ بھی ہماری طرح انسان تھے جن سے لغزشوں اور التباسات کا صدور فطری ہے۔ ہم اس بات کے ہرگز سزاوار نہیں کہ دوسروں کے التباسات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھریں۔ ہمارے لیے اپنے التباسات کا بوجھ ہی کیا کم ہے۔

۴- تقلید اور اصلاح ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور نہ ہی تقلید اور تنویر (Enlightenment) کا اجتماع ممکن ہے۔ دانش انسانی کے استعمال میں سابقین کے تجربات سے ہم کسب فیض تو ضرور کرسکتے ہیں البتہ اس بات پر اصرار نہیں کرسکتے کہ اس عمل میں ہمارے اور ان کے نتائج یکساں ہوں۔ اگر نتائج کی یکسانیت کو ہدف قرار دے دیا جائے تو غور وفکر کا سارا

سلسلہ لایعنی قرار پاتا ہے۔ البتہ ہمیں اس بات کا التزام کرنا ہوگا کہ غور وفکر کے نئے مراحل میں تقویٰ شعاری کا دامن ہمارے ہاتھوں سے نہ چھوٹنے پائے۔ قرآن مجید کے مطالعے میں دانش انسانی کے ساتھ ساتھ تقویٰ شعاری کی نگہبانی بھی لازم ہوگی۔ اور یہ بھی ممکن ہے جب ہم علوم عقلیہ اور نقلیہ کو ایک دوسرے کا حریف تصور کرنے کے بجائے اس کے باہمی تعاون سے ایک ایسی روشنی کی تخلیق کرسکیں جسے reflective knowledge کہا جاسکتا ہے، جو Enlightenment کے بجائے Buddhist bodhi سے کہیں زیادہ قریب ہے۔ reflective knowledge میں نہ dogmatic fixity یا مفتیانہ انجماد پایا جاسکتا ہے اور نہ ہی وہ بے سمتی جو Enlightenment کی لازمی منزل post-modernism سے عبارت ہے۔

۵- ماضی میں مصلحین اسلام کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے بعض امور کو تحقیق وتجزیے سے بالاتر قرار دے رکھا تھا جس پر کسی گفتگو کا دروازہ کھولنا ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اتحاد امت کے تمام علمبردار اپنے اپنے فقہی دائرۂ کار کے اندر ہی فکری وعملی سرگرمیوں کو روا سمجھتے تھے۔ ائمہ فقہاء اور ائمہ محدثین کی عقل ودانش اور ان کے علمی کاموں کو منزل من اللہ کا درجہ حاصل تھا۔ بعض مصلحین مثلاً شاہ ولی اللہ جیسے علماء تو اس خیال کی بھی پرزور وکالت کرتے تھے کہ مسالک اربعہ کا تعین من جانب اللہ فیصلہ ہے جس میں متقدمین کو تائید ایزدی حاصل رہی ہے۔ فی نفسہ یہ کچھ اسی قسم کی بات تھی جس کا اظہار عیسائی علماء مروجہ بائبل میں پال کی تحریروں کے سلسلے میں اسے Holy Spirit کا مرہون منت بتاتے اور اسے من جانب اللہ تصور کرتے ہیں۔ نئے مصلحین کے لیے لازم ہوگا کہ وہ آخری رسول پر آنے والی وحی کے علاوہ عام انسان کے الہام یا اس کو حاصل ہونے والی مفروضہ تائید ایزدی کو قطعی اہمیت نہ دیں۔ جب تک انسانی تعبیرات اور اس کے تعمیر کردہ مسالک کی بنیادیں نہیں ہلتیں حقیقی اسلام کی طرف ہماری واپسی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

۶- آخری رسول کے متبعین کی حیثیت سے ہم سیادت عالم کے منصب پر فائز کیے گئے ہیں۔ اس عظیم فریضے کی ادائیگی کے لیے لازم ہے کہ ہم آفاقی طرز فکر کے حامل ہوں۔ افسوس کہ ہم صدیوں سے امت مسلمہ کے بجائے امت محمدیہ کی نفسیات میں محصور شب وروز قوم مسلم کے عروج کے لیے فکرمند اور سرگرداں ہیں۔ ہمارے isolationist رویے نے ہماری نظری اور نفسیاتی ہیت ترکیبی کو بری طرح مسخ کردیا ہے۔ رحمۃ للعالمین کے متبعین نہ جانے کن مفروضہ روایتوں کے زیر اثر آج اس خیال کے اسیر ہیں کہ جس رسول کو رحمۃ للعالمینی کے منصب پر فائز کیا گیا تھا وہ خود دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوا کہ اس کی زبان پر صرف امتی امتی کا لفظ جاری تھا۔ کلمۃ سواء کی قرآنی بنیاد نئے مصلحین سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ سکڑتی ہوئی دنیا میں مختلف ادیان کے مابین ہونے والے مکالمے اور مباحثے کو بھی پیمبرانہ رخ دینے کی جدوجہد کریں۔ دائرۂ امت سے باہر دنیا کو امن وسکون سے آشنا کرنے کے لیے جو کوششیں ہورہی ہیں ان سے ہم خود کو الگ نہیں رکھ سکتے۔

تحریک اصلاح کا ہدف اسلام میں کوئی اساسی تبدیلی نہیں بلکہ ان انسانی تعبیرات کا محاکمہ ہے جو اپنے تاریخی اور مکانی تناظر کے غیاب کی وجہ سے اب فرسودہ معلوم ہوتی ہیں۔

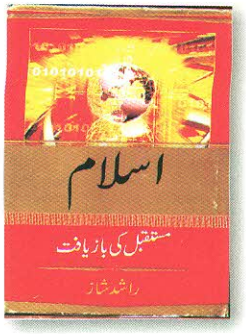

۷۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اسلام کی چودہ صدیوں پر محیط تہذیبی ورثے پر بلا خوف لومۃ لائم تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ خدا کے کلام اور رسولؐ کی سنت کے علاوہ ہمارے لیے کوئی چیز تحلیل و تجزیے اور محاکمے سے بالاتر نہیں ہونی چاہیے۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر زبان بندی کو غایت دین سمجھا جائے یا جسے سیکورٹی زون قرار دے کر وہاں کسی مناقشے کو داخل ہونے سے روکا جائے۔ وحی ربانی کی روشنی میں جب تک ہم اپنی پوری تاریخ کا تنقیدی محاکمہ نہیں کرتے ہمیں اس بات کا واقعی اندازہ نہیں ہوسکتا کہ پانی مرتا کہاں ہے۔

۸۔ نئے مصلحین کو اس بات کا التزام بھی کرنا ہوگا کہ وہ وحی ربانی کے مقابلہ میں صدیوں کے متوارث عمل کو، خواہ اس پر مفروضہ اجماع کی مہر کیوں نہ لگ گئی ہو، از سر نو تحلیل و تجزیے کا موضوع بنائیں۔ اب یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ کسی مخصوص مسئلے پر فلاں فلاں فقہاء اور ائمہ کی کتابوں میں یوں لکھا ہے یا یہ کہ فلاں مسئلہ پر امت کا اجماع ہو چکا ہے جسے از سر نو بحث کی میز پر نہیں لایا جا سکتا۔ خدا کے علاوہ انسانوں کے کسی گروہ کو اس بات کا اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اجماع کی دھونس دے کر یا اہل حل وعقد کے حوالے سے ہمیں کسی مسئلہ پر تحلیل و تجزیے سے باز رکھے۔ یہ رویہ قرآن کے rational discourse کے خلاف ہے۔ جب اللہ تعالیٰ خود توحید کے بنیادی اعتقادات کو ہمیں عقلی استدلال کے ذریعہ باور کرانا چاہتا ہے اور جب قرآن اپنے ماننے والوں سے اس بات کا طالب ہے کہ وہ تحقیق و تجزیہ کے ذریعہ

اشیاء کی ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کریں تو پھر عام انسانوں کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا ہے کہ وہ اکثریت کے حوالے سے یا ﴿وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ﴾ کے سہارے ہمیں کسی مسئلہ کو طے شدہ یا closed for discussion باور کرائیں۔ نئے مصلحین پر لازم ہوگا کہ وہ نص قرآنی یعنی شرع اور مدون شریعت جیسا کہ وہ فقہ میں جلوہ گر ہوئی ہے، کے مابین امتیاز قائم کریں۔ اگر قرآن کی طرح فقہاء کے دواوین کو بھی یکساں تقدس عطا کر دیا گیا، جیسا کہ ماضی میں مصلحین کرتے رہے ہیں، تو پھر کسی نئی ابتداء کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مکالمے اور مباحثے کی روایت دم توڑ چکی ہو اور جہاں صداقت dogmatic fixity سے عبارت ہو، نئے مصلحین کے لیے ایک نئے طرز فکر کی تعمیر یا ہمہ گیر discourse کی ابتدا کچھ آسان نہیں کہ ایسا کرنا بند معاشرے سے کھلے معاشرے میں داخل ہونے کے مترادف ہوگا۔ اتنی بڑی ابتدا یقیناً کچھ آسان نہیں لیکن اس کے علاوہ اب ہمارے پاس کوئی دوسرا متبادل ہے بھی نہیں۔